ساحر شفیق کی نظموں میں مزاحمت کی پیش کش

The Articulation of Resistance in the Poems of Sahir Shafiq

حسن بزدار [i] ڈاکٹر حماد رسول [ii]

Abstract:

Sahir Shafiq is a renowned poet known for writing cross poems using innovative styles and techniques. His poetry engages with themes of resistance, protest, and counter-narratives against political imbalance, religious intolerance, social alienation, erosion of social values, existential anxiety, and cultural decay. Through the effective use of similes, abstract imagery, and distinctive poetic strategies, he critically observes social maladies, including terrorism as a consequence of dictatorship and authoritarian structures. In his poems, Sahir Shafiq consistently raises his voice in favour of freedom, human dignity, and harmony with nature, reflecting a deeply humanistic vision. In recent years, his poetry has made a significant impact on Pakistani society by resonating with contemporary social consciousness and intellectual discourse.

Keywords: *Sahir Shafiq, Urdu Poem, Existentialism, Terrorism, Dictatorship, Intolerance.*

ساحر شفیق ایک معروف شاعر ہیں جو کراس نظم کو نئے اسلوب اور تکنیکی تجربات کے ساتھ برتنے کے لیے جانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مزاحمت، سیاسی عدم توازن، مذہبی عدم برداشت، سماجی تنہائی، اقداری زوال، وجودی اضطراب اور ثقافتی شکست و ریخت کے خلاف ایک مضبوط جوابی بیانیہ نظر آتا ہے۔ تشبیہوں، تجریدی پیکروں اور منفرد شعری تکنیکوں کے بامعنی استعمال کے ذریعے وہ سماجی بیماریوں کا گہرا مشاہدہ پیش کرتے ہیں، وہ بالخصوص آمریت اور جابرانہ نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والی دہشت گردی کو موضوع بناتے ہیں۔ ساحر شفیق کی شاعری میں آزادئ اظہار، انسانی وقار اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگ زندگی کے حق میں ایک واضح اور توانا آواز سنائی دیتی ہے، جو ان کے انسان دوست شعور کی غمازی کرتی ہے۔ حالیہ برسوں میں ان کی نظموں نے پاکستانی معاشرے میں گہرا اثر چھوڑا ہے اور عصری سماجی شعور اور فکری مباحث کے ساتھ ایک مضبوط رشتہ قائم کیا ہے۔

کلیدی الفاظ: ساحر شفیق، اردو نظم، وجودیت، دہشت گردی، آمریت، عدم برداشت۔

تاریخ عالم میں مختلف علوم وفنون پر نظر ڈالیں تو ان کی تشکیل وترویج مختلف مراحل سے گزرتی نظر آتی ہے کچھ علوم وفنون کے بانیوں نے انھیں رد کر دیا اور نئی راہیں تلاش کیں بعض کسی بڑے سماجی، ثقافتی اور سیاسی حادثے کے نتیجہ میں اپنا رخ بدل گئے اور بعض کو افراد کی طرف سے شدید رد عمل کا سامنا رہا کہ ان فنون کا کوئی پہلو ایسا تھا جو افراد کے اہداف، مفادات اور دلچسپیوں کے متصادم تھا جس وجہ سے سماج کے کسی خاص گروہ یا پورے سماج نے اسے قبول نہیں کیا۔ رد قبول کے اس سلسلے میں ہمیں مختلف افراد اور تحریکیں نظر آتی ہیں جنھوں نے علم وفن کے کسی خاص نظریے کے لیے احتجاج رد عمل اور مزاحمت کا راستہ اختیار کیا عمومی طور پر دیکھنے میں آیا کہ کسی سماج میں مقتدرہ قوتیں عام لوگوں کے حقوق کو دبانے کے لیے

[i] اسکالر پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، زکریا یونی ورسٹی ملتان۔
[ii] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، زکریا یونی ورسٹی ملتان۔ (Corresponding Author)

مختلف حربے استعمال کرتیں ہیں تو اس سماج کے ادیب، دانش وَر اور فن کار ان کے خلاف مزاحمت کا راستہ اختیار کرتے ہیں ان کی یہ مزاحمت فن کے مختلف قرینوں سے ڈھل کر سامنے آتی رہی ہے اور ان قوتوں کو چنوتی دیتی رہی ہے۔ مزاحمت کی یہ آوازیں دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف وقتوں میں بلند ہوتی رہی ہیں اور ان کے دور رسد اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ باشعور انسانوں کی یہ مزاحمت ہمیشہ اپنے عہد کے جبر اور استحصالی نظام کے خلاف رہی ہے اس مزاحمت کے عمل میں ادیب اور شاعر پیش پیش رہے ہیں۔

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم لکھتے ہیں:

> یہ سچ ہے کہ ہر عہد کا ادیب اپنے زمانے کے جبر رواں نظام کی بے چینی، نیز عوام کی بے بسی سے مضطرب ہو کر ہی قلم اٹھاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس درد کو جو اس کے عہد نے اسے دیے ہیں صفحہ قرطاس پر کچھ اس نوع سے بکھیرے کہ اس کی آواز پر عہد کی آواز میں شامل ہو سکے۔ اگر وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوتا ہے تو اچھا ادب ظہور میں آتا ہے ورنہ ادب کو نعرہ میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔[۱]

اردو ادب پر نظر ڈالیں تو ہمیں احتجاج اور مزاحمت کے رویے ہر دور میں نظر آتے ہیں کسی بھی سماج کا ادیب اپنے عہد کا ضمیر ہوتا ہے اس کی ہمدردی اور جرأت ہمیشہ محکوم آوازوں کے ساتھ ہوتی ہے وہ سماج میں آنے والے بدلاؤ، تغیرات اور انسانی وقار کے معتوب ہونے پر چونکتا ہے اردو ادب کی تاریخ میں مختلف ادوار میں شعراء نے اپنے عہد کے مسائل کو اپنی آواز سے اجاگر کیا اور اپنے فن کے ذریعے خرابی کی ان صورتوں میں حل بھی تجویز کیے۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے خاص طور پر آمریت، سرمایہ داریت اور مذہبی منافرت کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے علاوہ مختلف تحریکوں، جلسے، جلسوں، تقریروں اور احتجاجی مظاہروں کے ذریعے اپنی مزاحمت کو جاری رکھا۔ قمر رئیس لکھتے ہیں:

> یہ انحراف کسی سماجی یا انسانی صورتحال کا انفرادی رد عمل ہی ہوتا ہے اور یہ رد عمل ابتدائی شکل میں فطری اور اضطراری ہوتا ہے کسی طرح نفسیاتی موشگافیوں میں جائے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ انحرافی رد عمل انسانی ضمیر کی آواز ہوتا ہے۔[۲]

اردو ادب میں مزاحمت کا رویہ پاکستان میں ۱۹۷۷ء کے مارشل لا اور ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی

کے بعد شدت سے سامنے آیا۔ جبر کے اس عہد میں اردو ادیبوں کی یہ مزاحمت تحریری جد و جہد کی صورت میں سامنے آئی۔ پاکستان میں مارشل لا کے مختلف ادوار میں قومی زندگی کسی نہ کسی سطح پر ضرور متاثر ہوئی۔ سوچنے سمجھنے والے انسان نے اس کا ادراک کیا اور رد عمل کے طور پر نئی مزاحمتی فکر سامنے آئی جو زیادہ تر شاعری کی صورت میں تھی۔ مزاحمت کی اس تحریک میں اردو ادیب اور شاعر انسانی فطرت کے خلاف اس جبر کے رویے کے خلاف ڈٹ گئے۔ انھوں نے ماریں کھائیں، جیل کاٹیں مگر سچ اور حق کے ساتھ کھڑے رہے ان کی آواز کو دبایا گیا لیکن ختم نہیں کیا جاسکا۔

فخر زمان لکھتے ہیں:

> آزادی، مساوات کے لیے جہاد اور جبر کے خلاف سینہ سپر ہو جانے کا نیا شعور ہمارے مستقبل کا منشور ہے۔[۳]

اردو ادب کی اس مزاحمتی تحریک میں ادباء اور شعراء کی بڑی تعداد شامل رہی مزاحمتی، نظموں اور غزلیات پر مشتمل انتخابات شائع کیے گئے، انقلابی فکر پر مبنی مشاعرے ہوئے۔ عملی طور پر احتجاج کیا گیا پمفلٹ، جلسے جلوس، ریلی اور ہڑتال اس کے مختلف مرحلے اور حربے رہے۔ یہ شعراء اور ادیب کسی خاص سیاسی جماعت کی بجائے اپنے نظریے سے جڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے مزاحمت کے عمل کو ملک گیر تحریک میں بدلا، پابندیوں، رکاوٹوں اور قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود ادیبوں کی یہ مزاحمت ایک قومی مزاحمتی تحریک میں ڈھل گئی اور آخر کار فسطائیت اور آمریت کے عہد کا خاتمہ ہوا۔

اردو ادب میں یہ مزاحمت مختلف عناصر کی مدد سے تشکیل پاتی رہی ہے یا یوں کہیے کہ یہ مزاحمت مختلف صورتوں میں سامنے آتی رہی ہے ہیئت، اسلوب اور تکنیک کے تجربات ان فنون میں نئی راہیں تلاشنے اور بات کرنے کے ڈھنگ کو سامنے لاتے رہے ہیں۔ یہ مزاحمت تحریر کی صورت میں سامنے آتی رہی ہے۔ معلوم انسانی تاریخ میں تحریر ہی سب سے محفوظ صورت رہی ہے۔ تحریر کی ان صورتوں میں مضمون، کہانی، افسانہ، ناول، انشائیہ، نظم، غزل اور مزاح شامل ہے تحریر کبھی علامت میں ڈھل کر اور کبھی تشبیہ اور استعارات کی صورت میں اپنی فکر کی ترسیل کرتی رہی ہے۔

برصغیر میں ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں میں تحریک آبادی کا سفر آغاز ہوا جس میں انگریز سامراج کے خلاف مزاحمت اس کی اولین کڑی تھی۔ طویل مزاحمتی جدوجہد کے بعد برصغیر کے مسلمان تقسیم ہند تک

پہنچے۔ سر سید احمد خان سے علامہ اقبال تک اس مزاحمت نے مختلف روپ اختیار کیے۔ بر صغیر میں اس مزاحمتی سفر میں شعراء کا کردار ایک مضبوط کڑی ہے۔ اسی طرح دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو جبر، طاقت اور استحصال کا رویہ طاقتوروں کی طرف سے جاری رہا جس کی وجہ سے دنیا میں نسل پرستی، بھوک، غربت قومی اقتصادی، استحصال، سامراجیت، وطن، دھرتی ماں، ثقافت اور طبقاتی تضاد کی وجہ سے مزاحمتی آوازیں بلند ہوتی رہیں ہیں۔ دنیا میں جب پہلی بار ظلم ہوا تو اس کے خلاف مزاحمت کی آواز بھی اسی وقت بلند ہوتی۔ افضل توصیف لکھتے ہیں:

> ہابیل اور قابیل کے تصادم سے جو کیفیت پیدا ہوئی وہی کیفیت مزاحمتی ادب کا پہلا بیج بنی ہوگی۔ پھر آگے نظریاتی تضاد شروع ہوئے۔ موسیٰ اور فرعون کے درمیان تضاد، نمرود اور ابراہیم کے درمیان کشمکش اور آگے حسینی اور یزیدی قدروں کا تصادم ادیب اور شاعر کے لیے ایسے رویے کی تحریک بنا ہے کہ وہ کسی ایک طرف شامل ہو جائے لیکن ادب کبھی ظالم اور جابر کا طرفدار نہیں ہو سکتا۔[۴]

یورپ میں انقلاب فرانس سے لے کر اب تک بہت سی مزاحمتی تحریکوں نے جنم لیا۔ انقلاب روس کے بعد معاشی تحفظ کی تحریک نے بر صغیر میں ترقی پسند تحریک کو جنم دیا جو یہاں مزاحمت کی صحیح معنوں میں ترجمان ہی یورپ میں بادشاہت اور کلیسا دو بڑے طاقتور ادارے رہے ہیں اور دونوں کے گٹھ جوڑ نے عوام کو ایک دائرے تک محدود کر دیا لیکن سائنس کی ترقی نے کلیسا کے رازوں کو افشاء کرنا شروع کیا اور بادشاہت پر مسلسل سوالات کیے تو دونوں ادارے اپنی برتری کھو بیٹھے۔ کہیں یہ مزاحمت نسلی تفاخر کے خلاف ہوتی اور کہیں، قدامت پسندی، رجعت پسندی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی اقدار کے جمود کے خلاف مزاحمت سامنے آتی۔ اس مزاحمت میں سب سے نمایاں فنون لطیفہ رہے۔ موسیقی، مصوری، شاعری فن تعمیر اور کہانی کہنے کا فن اس میں سر فہرست رہے۔

اروِن ایڈمن لکھتے ہیں:

> اکثر ایسا ہوا تو ہے کہ فن مسلمات عقلی سے انحراف بن گیا ہے چاہے یہ صورت تھوڑے ہی عرصے کے لیے قائم رہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی فکر کے آغاز سے اب تک مختلف جماعتوں نے فن کی مذمت کی ہے اور اس حقارت کی نگاہ سے دیکھا

ہے۔ معلّمین اخلاق نے سب سے زیادہ فن کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ جو لوگ زندگی کے مصائب اور بدانتظامیوں کو رفع کرنے میں منہمک تھے۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ فن زندہ رہے کہ سنجیدہ کام سے منقطع ہو جانے کا نام ہے۔ زیست کے سلیقے کے خلاف ہے اور روح کو خواہ مخواہ عالم محسوسات میں لے جاتا ہے۔[۵]

جدید دنیا میں انقلاب فرانس سے انقلاب روس تک پہلی جنگ عظیم سے دوسری، تقسیم ہند، صنعتی انقلاب، سامراجیت، نوآبادیت کے خلاف مزاحمت کا آغاز ہوا۔ امریکہ کی سرمایہ دارانہ برتری سے دنیا میں عدم توازن پیدا ہوا۔ دنیا کے مختلف معاشروں میں فرد تنہائی، اداسی، بے زاری اور لایعنیت کا شکار ہوا۔ ان کے روزمرہ کے معمولات سے لے کر لکھنے پڑھنے کا کام کرنے کا عمل متاثر ہوا۔ ان کے ہاں ایک نئے طرز احساس نے جنم لیا۔ اس فکری طرز احساس کی بنیاد مزاحمت پر رہی۔

ڈاکٹر عارف ثاقب لکھتے ہیں:

کسی معاشرے کا طرز احساس اس عہد کے مجموعی مزاج کا نہ صرف تعین کرتا ہے بلکہ آئینہ دار بھی ہوتا ہے۔ معاشرتی اقدار، رسوم ورواج، تہذیب وتمدن کی مختلف جہتیں، اعلیٰ وادنی معیارات، خیالات، جذبات واحساسات کے مختلف سانچے اور زاویے، طرز احساس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار اور روایات، طرز احساس پر اثر انداز ہوتی ہے۔[۶]

عالمی سطح پر مزاحمت کی آوازیں وجودیت، مارکسزم، سیریلزم، ڈاڈاازم، مابعد جدیدیت اور علامت نگاری کے ذریعے سامنے آئیں۔ اردو ادب میں فکشن اور شاعری دونوں اصناف میں مزاحمت کی نمایاں آوازیں سامنے آئیں۔ اردو افسانہ میں آغا سہیل، اختر جمال، احمد داؤد، انتظار حسین، اسد محمد خان، انوار احمد، انور سجاد، خالدہ حسین، رشید امجد، سمیع آہوجا، محمد حمید شاہد، مرزا حامد بیگ، مسعود اشعر، منشا یاد اور شرف احمد نے دہائیوں تک مزاحمت کی آواز کو زندہ رکھا۔ اردو ناول میں پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، عزیز احمد، رامانند ساگر، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، قاضی عبدالستار، جوگندر پال، عبدالصمد، شموئل احمد، انیس ناگی اور انور سجاد نے سامراجیت، آمریت اور جاگیرداری، نظام کے خلاف مزاحمت کو ناول کا حصہ بنایا، اسی طرح اردو ڈراما میں عصمت چغتائی، کرشن چندر، بلراج ساہنی، سعادت حسن منٹو، ابراہیم جلیس،

احمد ندیم قاسمی، مجنوں قمر اور راجندر سنگھ بیدی نے طنز و مزاح کے عنصر کے ساتھ تھیٹر کے ذریعے مزاحمت کے رویے کو عوام تک پہنچایا۔

اردو ادب میں مزاحمت کی سب سے توانا آواز شاعری کے زاویے سامنے آئی۔ قیام پاکستان کے بعد اردو غزل، آزاد نظم، پابند، نظم، نظم معریٰ اور نثری نظم نے اس سفر کو آگے بڑھایا۔ جوش، اقبال، فیض، ناصر کاظمی، جون ایلیا، منیر نیازی، عرفان صدیقی، ابن انشاء، احمد فراز اور شہزاد احمد نے اردو غزل میں، راشد، میراجی، مجید امجد نے آزاد نظم کے ذریعے انسان اور سماج کے رشتے میں پیدا ہونے والی دراڑوں کو محسوس کیا اور تنہائی، بے گانگی اور رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کو اپنی شاعری کے ذریعے جوڑا۔ جدید اردو نظم نے صرف ایک خطے کی بات نہیں کی بلکہ عالمی سطح پر موجود سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی صورتحال کو اس انداز سے موضوع بنایا کہ ان کے ہاں پوری دنیا گلوبلائزیشن کا روپ اختیار کر گئی۔ ان کی مزاحمت عالمی سامراج اور سرمایہ دار کے خلاف رہی۔

اکیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے آغاز میں ملتان سے ساحر شفیق کی نثری نظموں کا مجموعہ خود کشی کا دعوت نامہ شائع ہوا تو یہ مجموعہ ملتان میں نثری نظموں کی ایک تحریک ثابت ہوا۔ ان نظموں کے تتبع میں درجنوں شعراء نے نثری نظم کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ملتان کی تنقیدی محافل میں نثری نظم پر بحث کا آغاز ہوا اور پہلی بار نثری نظم کے مشاعروں کا آغاز ہوا۔ شاعر شفیق کی نظموں کا عمومی مزاج مزاحمت ہے اردو نظم کی روایت میں نثری نظم نے مابعد جدید صورتحال کو اپناتے ہوئے۔ اس کے طے شدہ ضابطوں کو رد کر دیا۔ بیسویں صدی کے آخر میں دنیا جس قدر تیزی سے بدل رہی تھی۔ یہ نثری نظم ہی تھی جو اس صورتحال کو اپنے اندر سمو کر ایک رد عمل دے سکتی تھی۔ ساحر شفیق نے اپنی نظموں میں اس صنف کو ایک بھرپور جواز فراہم کیا کہ نثری نظم کے پاس بات کہنے کا وہ ڈھنگ اور اسلوب ہے جو پابند شاعری میں ممکن نہیں ہے۔

ساحر شفیق نے سماج کی گھمبیرتا کو موضوع بناتے ہوئے فرد کی تنہائی، سماجی رشتوں کی توڑ پھوڑ، اخلاقی اقدار کا زوال، ثقافتی گھٹن، مقتدر قوتوں کی طرف سے عام لوگوں کا استحصال، مذہبی منافقت، فرقہ واریت، بے زاری، اکتاہٹ اور وجودی کرب کو موضوع بناتے ہوئے۔ عاشق اور محبوب کے روایتی تصور کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ ان کی نظم علامت اور امیج کے سہارے مزاحمت کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ انھوں نے سماجی اقدار، جبر، ظلم، تنہائی اور اکتاہٹ کے خلاف ایک متبادل بیانیے کو جنم دیا۔ فرد کی آزادی اور روشن خیالی کو

ISSN:2708-5724, E-ISSN:2708-5732

دبانے والی مقتدر قوتوں اور مذہبی انتہا پسندی کے خلاف انھوں نے ایک دانشور کی آواز کو ابھارا ہے۔ ہم اپنے سماج میں اکتاہٹ کا شکار کیوں ہیں۔ یہاں دوسروں کو ان کی مرضی کے ساتھ جیسے کیوں نہیں دیا جاتا۔ یہاں ہجوم کی نفسیات کیوں غالب آتی جارہی ہے۔ ایک عام آدمی مزید تنہائی کا شکار کیوں ہوتا جارہا ہے یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جن کا جواب ساحر شفیق تلاش کرتے ہیں۔

ساحر شفیق کی نظموں میں مزاحمتی عناصر کے حوالے سے تنویر صاغر لکھتے ہیں:

> ساحر شفیق کا شعری جغرافیہ انفرادی مزاحمت کا عمدہ نمونہ ہے جو اجتماعی مزاحمت کے لیے فضا ہموار کرتا ہے اور اس سازگار فضا کے لیے ہمارے اندر ہیجان برپا کر دیتا ہے انفرادی مزاحمت دراصل اجتماعی مزاحمت کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور اجتماعی مزاحمت بغاوت کا اس بغاوت کا پیغام ہمیں نظموں کے بطن میں منتشر کیفیات سے ملتا ہے ان منتشر کیفیات کی بازگشت اپنے Sound Inspact میں دھیمی لے سے گریز برتتی ہے کیوں کہ فرد جب اپنی ذات سے شعری مواد حاصل کر کے اسے سماج تک پھیلا دے تو کرختگی، شدت، غصے اور ردعمل ایسے اجزاء زندگی کی لاحاصل تہذیبی اضطراب اور معاشرتی پیچیدگیوں ایسے معاملات سے لبریز ماحول ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور ہمیں اپنا محاسبہ کرنے کی نہ صرف دعوت دیتے ہیں بلکہ ہمارا احتساب ان متنی صداقتوں میں مل جاتا ہے۔[۷]

ساحر شفیق کی مزاحمت دنیا میں اکیلے رہ جانے والے فرد کے لیے ہے وہ فرد کی نفسیاتی، سماجی یا معاشی خانوں میں نہیں بانٹتا بلکہ فرد کو ایک کلیت میں دیکھتا ہے۔ وہ فرد کو اس کی جذباتی بے حرمتی سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ فرد کی ذہنی فکری بالادستی قائم رہے۔ دوسرے لفظوں میں ساحر شفیق وجودی اور روحانی انقلاب کی صورت دنیا کو بدلنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کی نظم ''آدمی موت کی طرف بڑھ رہا ہے'' سے یہ اقتباس دیکھئے:

آدمی کو مدت سے ڈر لگتا ہے
آدمی کو موت سے ڈر نہیں لگتا
آدمی کو خود سے ڈر لگتا ہے

آدمی کو خود سے ڈر نہیں لگتا
موت ڈر کو ختم کر سکتی ہے
ڈر موت کو ختم کر سکتا ہے
ڈر موت کو اور موت ڈر کو ختم کر سکتی ہے
ڈر اور مدت آدمی کو ختم کر سکتے ہیں
آدمی ڈر اور موت کو ختم کر سکتا ہے
آدمی آدمی کو ختم کر سکتا ہے
آدمی نے آدمی کو ختم کر دیا ہے
موت تھر تھر کانپ رہی ہے۔۔۔
آدمی موت کی طرف بڑھ رہا ہے[۸]

ساحر شفیق نے سماج میں بڑھتے ڈر، خوف اور انتشاری کیفیت سے لبریز واقعات کو نظموں کا حصہ بنایا ہے اور خود کشی کو بطور احتجاج اور مزاحمت کے پیش کیا ہے۔ اس نے ایک لکھاری کی آنکھ سے سماج میں موجود فرد کو دیکھتے ہوئے مزاحمت اور احساسات کی شدت کو اپنی نظموں میں فرد پر ہونے والے جبر سے نجات کے لیے آلہ کے طور پر برتا ہے وہ فرد کے نوحے کو اپنی نظم "اپنے سب سے بڑے دشمن سے ملاقات" میں یوں پیش کرتے ہیں:

یادیں نظر نہ آنے والے حشرات کی طرح
مجھے اندر سے کھود رہی ہیں
شاہد میں جان بوجھ کر کچھ بھی نہیں بھولنا چاہتا
میں ہی اپنا سب سے بڑا دشمن ہوں
کاش میں نے کچھ گالیاں بچا کر رکھی ہوتیں[۹]

ساحر شفیق نے فرد کو اپنی ذات تک پہنچنے کا راستہ دکھایا ہے کیوں کہ فرد داخلی ٹوٹ پھوٹ سے گزرتے ہوئے لاحاصل کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے اسے میں ان کی نظمیں خود کشی کو مزاحمت کے معنوں میں برتتی ہیں۔ فرد موت کو گلے لگائے ہوئے اپنا احتجاج ان نظموں میں درج رکھوانا ہے "پیشہ ور" نظم سے

ISSN:2708-5724, E-ISSN:2708-5732

یہ اقتباس دیکھئے:

"بیزاری کے اندھے کبوتر نے
توقعات کی تتلیوں کو چگ لیا ہے
اور
دیوار پر لکھی ہوئی نیند کی آنکھوں میں
بیگانگی کی چمگادڑ بچہ جن رہی ہے
ہم فاصلے کی طرح بڑھ رہے ہیں
اگر آنے والے وقتوں میں بھی تاریخ لکھنے کا چلن رہا
تو ہمارے بارے میں لکھا جائے
کہ ہم نے ایک دوسرے کو کتے کی طرح
سونگھ کر چھوڑ دیا"[۱۰]

فرد کی زندگی کئی طرح کی مصیبتوں سے عبارت ہے اسے اس کی مرضی کی سانس تک نہیں لینے دی جاتی۔ سماج میں بہت سے کردار ہیں جو محبت کرنے والوں کا شکار کرتے ہیں جو ذہین افراد سے ڈرتے ہیں جو کام کرنے والوں کو بے کار کے کاموں میں الجھا دیتے ہیں۔ یہ ملا، حاکم اور تاجر ہیں یہ دوست کا نقاب اوڑھے دشمن ہیں۔ یہ ہمارے ارد گرد بہت سے وہ کردار ہیں جو بظاہر ہمیں اپنے معلوم ہوتے ہیں اور ان کے ارادے ہم پر کبھی نہیں کھلتے۔ ساحر ان سب کے خلاف مزاحمت کرتا ہے:

وہ افرادی کی بری قسمت کو یوں بیان کرتے ہیں۔
"ہمارے ہاتھ بوڑھے ہو جاتے ہیں
ہمارے پاؤں چرا لیے جاتے ہیں
دروازہ دیوار میں تبدیل ہو جاتا ہے
اور
ہم
آگ کے حمل کی طرح گر جاتے ہیں"

ساحر شفیق اپنی نظم "آخری خود کشی سے ذرا پہلے ایک دوست سے مشورہ" میں معنی خیز سوالات اٹھاتے ہیں جو اس سماج کی گھمبیرتا، فرد کے اکیلے پن اور اس پر ہونے والے ظلم کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہاں شاعر ایک ہارے ہوئے فرد کے طور پر مزاحمت کی آواز بنتا ہے وہ لکھتے ہیں:

مجھے بتاؤ کیا خود کشی کے بعد بھی زندہ رہنا ممکن ہے؟
کیا زندہ رہنے کے درمیانی وقفوں میں
خود کشی کرتے رہا جا سکتا ہے
بتاؤ ایک بار خود کشی سے میں کتنا مر جاؤں گا؟
اگر میں خود کشی کر لوں تو میرے اندر بلند ہوتی ہوئی
بیگانگی کی دیوار کر سکے گی؟
اور اگر اپنے ہی ملبے میں دبا میں سسکتا رہا
تو مجھے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے؟
کیا تم مجھے خود کشی کا کوئی ایسا طریقہ بتا سکتی ہو
جس میں میں پورا مر سکوں![۱۲]

ساحر شفیق اپنے سماج کا گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ خاص طور پر بیسویں صدی کے آخری عشروں میں جس طرح مقتدر قوتوں نے دہشت گردی کے لیے مذہب کو استعمال کیا۔ جس سے پوری دنیا میں ہماری شناخت متاثر ہوتی اور ہم نے دہشت گردی کی اس جنگ میں اپنا وقار شناخت اور انسانیت کو کھو دیا۔ وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ہم ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی طرح کیوں ناچ رہے ہیں۔ وہ کب تک ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر نفرت کی فصل اگاتے رہیں گے اور ہم ان کے ہاتھوں استعمال ہوتے رہیں گے۔ ہم اپنے ہی وطن کی مختلف ثقافتوں میں نفرت کا بارود بھرتے رہیں گے۔ ہمارے ہاں پہاڑوں سے برف کی بجائے خود کش حملہ آور اُتر رہے ہیں۔ ہمارے ہاتھ ہمارے ہی بھائیوں کے خون سے رنگے ہیں اور ہم مسجد، مندر اور کلیسا میں بٹ چکے ہیں۔ ہمیں اس ماسٹر مائنڈ کے خلاف مزاحمت کرتی ہے جو بکتر بند گاڑی میں بیٹھا خاموشی سے یہ کھیل کھیل رہا ہے اس ضمن میں ساحر شفیق کی نظم "غلام زندگی کا جہنم" تہہ در تہہ معنویت رکھتی ہے۔ اس نظم کو ہمارے اس انتشار اور دہشت بھرے عہد کا رزمیہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:

ISSN:2708-5724, E-ISSN:2708-5732

وہ ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ تم نہیں ہو
تم کہیں نہیں ہو
تم ہو ہی نہیں
پیدا ہوتے ہی ہمیں مٹی کے مرتبانوں میں بند کر دیا گیا
تاکہ ہمارا قد نہ بڑھ سکے
اور وہ ہمیں بالشتیے کہہ سکیں
بچپن میں انھوں نے ہمارے خوابوں کی غلط تعبیریں بتائیں
ہم سے دوسروں کے نام کے روزے رکھوائے گئے
ہمیں ایسی دعائیں یاد کروائیں گئیں
جو خود ان کی سلامتی کے بارے میں تھیں۔[۱۳]

ساحر شفیق کی نظموں میں مزاحمت کا ایک بڑا رجحان شناخت کے مٹنے کا ہے وہ اپنی آزادی اور شناخت حاصل کرنے کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں ان کے ہاں مسلسل جھنجلاہٹ، کوفت، گالی، جبر، اکتاہٹ، بے زاری اور بے گانگی نظر آتی ہے۔ جو درحقیقت ہمارے عہد کے فرد کی نفسیات کی درست ترجمانی ہے ہم جو صلاحیت رکھتے ہیں اس کے مطابق اس سماج میں ہمیں ہمارا حصہ نہیں ملتا بلکہ ہمارا حصہ کسی ایسے کو مل جاتا ہے جو اس کے لیے کوشش بھی نہیں کرتا۔ بھاگتے ہوئے گزاری گئی زندگی سے یہ اقتباس دیکھئے:

میں بھاگ رہا ہوں
میں بھاگ رہا ہوں
میرے پیچھے ایک جنونی آدمی لگا ہوا ہے
اور اس کے بڑے بڑے ہاتھوں میں
چمکتا ہوا خنجر ہے
میری اس سے کہاں دشمنی ہے؟
میں سوچ رہا ہوں اور بھاگ رہا ہوں[۱۴]

"انگلیوں پہ گنی ہوئی زندگی" میں وہ امید اور امید کے ٹوٹنے کے عمل کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں اور مزاحمت سے بھرپور عکس بناتے ہیں جو ہمارے بے بسی اور اکتاہٹ کی حقیقت نگاری ہے۔ لکھتے ہیں:

میرے پاس ایک خواب ہے
جو تقریباً اندھا ہو چکا ہے
میرے پاس ایک راستہ ہے
جو کہیں نہیں جاتا
میرے پاس ایک یاد ہے
جس کے بال سفید ہو چکے ہیں
میرے پاس ایک قہقہہ ہے
جو کبھی نہیں لگایا گیا
میرے پاس ایک آنسو ہے
جسے میں آئینے کے طور پر استعمال کرتا ہوں
میرے پاس ایک امید ہے
جس کے کان میں پانی چلا گیا ہے[۱۵]

"مجھ سے کوئی توقع نہیں رکھتا" میں ساحر شفیق شناخت کی تلاش میں خود کو وہ ظاہر کرتے ہیں جو اصل میں وہ نہیں ہیں۔ وہ مزاحمت کے مختلف درجوں کی نشاندہی یوں کرتے ہیں:

میں خود پہ چیخ سکتا ہوں
خود کو گرم چائے پینے پر مجبور کر سکتا ہوں
چلتے ہوئے پنکھے کو ہاتھ سے روکنے کے بارے میں سوچ سکتا ہوں
خود کو چینی زبان سیکھنے کا مشورہ دے سکتا ہوں
نشے کا بہانہ بنا کر اپنے راز بتا سکتا ہوں
میں خود کو پہچاننے سے انکار کر سکتا ہوں[۱۶]

ساحر شفیق کی بیشتر نظموں میں ہمیں دو کردار ملتے ہیں دو آوازیں یا دو مخالف افراد جو ایک دوسرے

کی ضد ہیں اور ایک دوسرے کے لیے باعث آزار "وہ اور ہم"، "ہم زندہ رہتے ہیں"، "لوگ بات کرنا پسند کرتے ہیں"، "وہ مجھ سے چھپتے پھرتے ہیں"، "بھیڑ میں پھنسی ہوئی تنہائی"، "ایک مشکل آدمی"، "آدھا زندہ مجسمہ" اور "میں تنہا ہوں" ایسی ہی نظمیں ہیں جہاں وہ اپنے مخالف فریق سے مکالمہ کرتے ہیں اپنی طاقت اور مزاحمت کو اس "تم" کے سامنے لاتے ہیں جو اصل میں اس سماج کا نوحہ اور مزاحمت ہے۔ نظم "وہ اور ہم" دیکھئے:

وہ ہمارے لیے جال بنتے ہیں
اور بھول جاتے ہیں
کہ ہمارے دانت کتنے تیز ہیں
انھوں نے ہمارے لیے آری ایجاد کی
حالاں کہ ہم درخت نہیں تھے
وہ ہمارے لیے پھندا تیار کرتے ہیں
اور نہیں بناتے ایک سیڑھی
ہماری گردن تک پہنچنے کے لیے
وہ ہمارے لیے قبر کھودتے ہیں
یہ جاننے کے باوجود
کہ زمین سے ہمارا کیا رشتہ ہے
جب تک انھوں نے ہمارے لیے کمزور پل بنایا
ہم تیرنا سیکھ چکے تھے[۱۷]

ساحر شفیق نے ایک انتہا پسند سماج میں، خودکشی کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ جیسے یہ کسی "تہوار" کا دعوت نامہ ہو۔ جب ہم خود پر ہوتے ہوئے ظلم کو دیکھ رہے ہوں۔ اس کے محرک کو سمجھتے ہوں۔ اس دشمن کے حربوں، چالوں اور رویوں پر بھی نظر رکھتے ہوئے تو پھر ہم اس دہشت، نفرت اور استحصال کی زندگی گزارنے پر کیوں مجبور ہیں۔ ساحر شفیق اپنی نظموں میں بار بار اس دشمن کی شناخت کرتے ہیں جس نے ہماری شناخت کو مجروح کیا ہے جس نے ہمیں غلام زندگی کے جہنم میں دھکیلا ہے جس نے ہمیں ہمارے اپنے

شہروں، گھروں اور لوگوں میں اکیلا کر دیا ہے یہ نظمیں مزاحمت اور احتجاج کو اس طرح مربوط کر کے آگے بڑھتی ہیں کہ ہم ان کی شدت کو اپنے اندر محسوس کرتے ہیں اور خود کو ان کا ہم نوا محسوس کرتے ہیں جیسے یہ سارا ماحول وہی ہے جس میں ہم سانس لیتے ہوئے گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ یہ وہی مجبور زندگی ہے جسے ہم اپنی مرضی کے برعکس طور پر بسر کر رہے ہیں۔ بسر کرتے چلے جا رہے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم (مرتب)، اردو ادب: احتجاج اورمزاحمت کے رویے (دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۰۴ء)، ۱۴۔

۲۔ قمر رئیس، ''ادب میں اختلاف، انحراف اور احتجاج کی معنویت''، مشمولہ: اردو ادب: احتجاج اورمزاحمت کے رویے، مرتبہ: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم (دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۰۴ء)، ۲۰۔

۳۔ رشید امجد (مرتب)، مزاحمتی اردو ادب (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۵ء)، ۷۔

۴۔ افضل توصیف، ''ادب میں مزاحمتی رویے''، مشمولہ: ادب لطیف، جلد ۷۵، شمارہ نمبر ۱۲ (لاہور: مکتبہ جدید پریس، نومبر۔دسمبر، ۲۰۱۰ء): ۹۴۔

۵۔ ارون ایڈ من، فنون لطیفہ اور انسان، مترجمہ: سید عابد علی عابد (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء)، ۳۵۔

۶۔ ڈاکٹر عارف ثاقب، بیسویں صدی کا طرزِ احساس (لاہور: غالب نما، ۱۹۹۹ء)، ۱۳۔

۷۔ تنویر صاغر، ''خود کشی کی غرض سے کی جانے والی خود کشی''، مشمولہ: خود کشی کادعوت نامہ، ساحر شفیق (ملتان: دستک پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ۱۳۔

۸۔ ساحر شفیق، خود کشی کا دعوت نامہ (ملتان: دستک پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ۳۸۔

۹۔ ایضاً، ۸۵۔

۱۰۔ ایضاً، ۲۲۔

۱۱۔ ایضاً، ۲۵۔

۱۲۔ ایضاً، ۳۱۔

۱۳۔ ایضاً، ۳۲۔

۱۴۔ ایضاً، ۷۴۔

۱۵۔ ایضاً، ۷۷۔

۱۶۔ ایضاً، ۱۱۹۔

۱۷۔ ایضاً، ۹۵-۹۴۔